سفر لکھنؤ

عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصفجاہی
ایچ - سی - یس
صدر المہام تعمیرات سرکار آصفی



از

رائے بالا پرشاد گوڑ
حیدرآبادی

۲۲ - اپریل ــــــــــ ۸ - مئی سنہ ۱۹۴۳ ع

With Best Complements.

سفر لکھنؤ

پیش لفظ

از

جناب رائے سری کرشن صاحب سنہا
بی۔ اے۔ یچ۔ سی۔ یس
سب کلکٹر۔ حیدر آباد دکن

زبان اُردو عہد شاہ جہانی میں مثل طفل نیم جان کسی تاریک گوشے میں اخری سانسیں لے رہی تھی۔ شعرائے کرام نے، جو ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، اس یتیم و اسیر کو جان بلب دیکھا۔ ہمدردی نے اُکسایا۔ اور انہوں نے اٹھا لیا۔ انہی ہمدردان وطن و خدمت گذاران ادب نے اس کی پرداخت میں تن دہی سے کام لیا۔ حیات نے وفا کی اور نیم جان طفل جوان ہو کر میر و غالب، ذوق و مومن، نسیم و سرشار، جیسی بلند پایہ ہستیوں کو اپنی گود میں کھلانے لگا۔ سبھوں نے ایک آواز میں کہا "یہ ہماری زبان ہے پیارے"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعصبات کی ٹٹیاں سد راہ نہ ہوئی تھیں۔ نسلی تفریق کی آندھیاں اُمنڈ اُمنڈ کر چراغ امن کو گل کرنے کے لئے کوشاں نہ تھیں۔ مشترکہ زبان کا تخیل سرگرم عمل تھا جو اُس زمانے کی بلند پایہ تصانیف میں رواں دواں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سیاسی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ حالات نے پلٹا کھایا۔ اور ہندی اُردو کی دو پتنگیں سیاسی ڈور کے سہارے فضا میں پیچ کھانے لگیں۔ کسی نے چپکے سے کہا "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے"، "ہندوؤں کو اُردو نہیں آتی"۔ دیوار کو کان تھے۔ اور ساری دنیا نے سن لیا۔ بات کیا تھی، کیا بنالی گئی۔ ان پرفتن حالات کے باوجود ہندوستان کے قدیم ہندو خاندانوں میں جو زیادہ تر کایتھوں اور کشمیری پنڈتوں پر مشتمل ہیں، یہ زبان اب بھی بولی، سنی اور لکھی جاتی ہے۔ یہ خاندان جس طرح زمانۂ قدیم میں اُردو زبان کو عام ہندوؤں میں متعارف و مقبول کیا۔ آج بھی حسب سابق اُردو زبان کی بے لوث خدمت گذاری میں سرگرداں ہیں۔ ایسے قدیم خاندانوں میں سے ایک خاندان

عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر کا بھی ہے جن کے آبا و اجداد نہ صرف عالم پرور و علم نواز تھے بلکہ ہندی ، اُردو ، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے ۔ باعث دلچسپی ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ راجہ بہادر خود بھی اُردو کے بڑے حامی اور خدمت گذار ہیں ۔

رائے بالا پرشاد صاحب کا تعلق حیدر آباد کے ایک قدیم کایستھ خاندان سے ہے ۔ جس میں اُردو اور فارسی کا شوق نسلاً بعد نسلاً چلا آیا ہے ۔ کچھ تو اسلاف کی خو اور کچھ تو خود ان کا علمی انہماک انہیں اس قابل بنایا ہے کہ ان کو صاحب طرز تحریر کہا جا سکتا ہے ۔ یہ میرے قدیم دوستوں میں سے ہیں اور اس وجہ سے ان کے علمی شوق و غیر معمولی استعداد سے بخوبی واقف ہو چکا ہوں ۔ یہ ایک با مذاق دوست ، مستعد ، سلیقہ شعار اور ہمدرد ماتحت اور اچھے شاعر و نثار ہیں ۔

رائے بالا پرشاد صاحب کا مرتبہ سفر نامہ بڑی خوبیوں کا حامل ہے ۔ میرے نزدیک اس سفر نامے کی بڑی خوبی اس کی دلچسپی ہے جو ان کی انوکھی طرز تحریر کی آئینہ دار ہے ۔ رائے صاحب نے زندگی ہنستے ہوے گذارا اور اس لئے ان کے سفر نامہ کی ہر سطر ہنستی ہے اور پڑھنے والے کو ہنساتی ہے ۔ چونکہ یہ ایک با کمال شوقین اداکار ہیں ۔ اس لئے ان کا انسانی طبیعتوں اور ذہنیتوں کا مطالعہ بہت ہی عمیق ہے ۔

رائے بالا پرشاد صاحب عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصفجاہی کے ۔ مستعد ۔ لائق ۔ وفا شعار ماتحت ہیں ۔ چونکہ راجہ بہادر لایق لوگوں کی سرپرستی فرماتے ہیں ۔ اس لئے ان کو سفر لکھنو میں راجہ بہادر کے ہمرکاب ہونے کا موقعہ ملا ۔ یہ سفر انہی دنوں کی یادگار رہے ۔ مجھے قوی امید ہے کہ قارئین کرام اردو کے ایک خاموش ۔ بے لوث خدمت گذار کا لکھا ہوا یہ سفر نامہ دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے ۔





عالیجناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر
صدر سبجکٹ آل انڈیا کائستھ کانفرنس لکھنؤ

دنیا چل چلاؤ کی جگہ ہے۔ پانی بہہ رہا ہے۔ ہوا چل رہی ہے۔ زمین پھر رہی ہے۔ سورج چاند ستارے گھوم رہے ہیں۔ رات آتی ہے دن جاتا ہے۔ رات جاتی ہے دن آتا ہے۔ سقراط کہتا ہے "زندگی ایک سفر ہے"۔ مذہب نے اسی قانون فطرت کا حصول علم اور تجربہ کا اساس مان کر حج اور تیرتھ کو مقدس فریضہ قرار دیا۔ دل کہتا ہے "سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں"۔ عقل کہتی ہے "اپنی سکت ڈھونڈلے"۔

اس مرتبہ ایسٹر میں عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات سرکار عالی آل انڈیا کایستھ کانفرنس کے چوالیسویں اجلاس کی صدارت فرمانے لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ مجھے بھی ہم رکاب رہنے کی سعادت میسر آگئی۔

یوں تو ہمارا زمانہ سیاسی بحران کا زمانہ ہے۔ منجدھار میں نیا ڈگمگا رہی ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا ہر طبقہ اس دوڑ میں شریک ہے اور ہر ایک کو آگے نکل جانے کی دھن ہے۔ لیکن بیڑا پار اسی کا ہے جس کا کھویا ہوشیار ہو۔ کایستھ طبقہ بالخصوص عجیب کشمکش میں ہے۔ مغلیہ دربار میں یہ بہت پیش پیش رہا ہے کہیں مال والے بنے رہے تو کہیں قانون گو۔ کہیں زمیندار تو کہیں منشی جی۔ غرض ہندو تمدن اور اسلامی ثقافت میں امتزاج ہو کر نئی کلچر کا ظہور ہو رہا تھا تو اس کے بنانے میں یہی کایستھ آگے آگے تھے۔ انہوں نے عوامی زبان بنا کر بات بنالی۔ حاکم مسلمانوں اور محکوم ہندوؤں میں رابطہ انہیں کے ہاتھوں مضبوط رہا۔ کمپنی بہادر کی حکومت میں بھی یہی لالہ بہادر راج کرتے تھے۔ قدیم ہندوستانی شان اور جدید سیاسی نظام دونوں میں بھی ان کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ یورپ کے زیر اثر اس دور میں جمہوریت کا نیا تصور کچھ پختہ سا ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے جتھے میں سماجی اور اقتصادی اصلاح کے لئے کانفرنس کا انعقاد اس وقت کیا جب کسی ہندوستانی گروہ کو بھی اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اس طریق کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس جتھے میں تعلیم یافتہ کی

تعداد صد فی صد ہے - لیکن بعض حضرات کی نا عاقبت اندیشیوں نے کچھ اختلافات پیدا کر دئے - ایسے نازک وقت پر قوم کی آنکھ ایک ایسے شخص کی متلاشی تھی جس کی شخصیت اختلافات کی خلیج پاٹ کر اپنی ذاتی اثر سے ساری قوم کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دے جو ایک شایستہ طبقے کے شایان شان ہے -

بیدار قوم پر بھی کٹھن وقت آتے ہیں - اور ایسے ہی آڑے وقتوں پر قائد جماعت کا امتحان ہوتا ہے اور یہی قائد بالاخر بگڑی بات بناتے ہیں - قوم کو نیا نعرہ دے کر نیا جوش اور نئی طاقت بھر دیتے ہیں - نئی حیات دیتے ہیں - مردہ قوم میں جان پڑھ جاتی ہے - ماحول پر قابو پانا حیات کی امتیازی خصوصیت ہے ورنہ موت اور بس -

اندرونی اختلافات شدید صورت اختیار کر گئے تھے - راجہ صاحب معز ہی کی با تدبیر قیادت پر قوم کو اعتماد تھا - لکھنو' کی کانفرنس کایستھوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے - راجہ صاحب ذی فہم کی صدارت قوم کے لئے لائق صد افتخار رہے - حکیم السیاست آصف سابع کی جوہر شناس نظروں نے جس کو پرکھا تھا اور نوازا تھا یہی تو وہ نگینہ تھا - ع :- قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری - یہ ایک فال نیک تھا کہ راجہ راجمان دھرم ونت خاندان کے چشم و چراغ کو قوم نے اپنا ہادی چن لیا تھا - مگر قوم کو آخر تک اندیشہ تھا کہ دوران جنگ میں مملکت آصفیہ کی ذمہ داریاں اور ادئی فرائض میں راجہ صاحب معز کی گوناگوں مصروفیات آپ کو قوم کی قیادت کی اجازت دے سکینگے بھی یا نہیں - لیکن حکیم السیاست اعلحضرت سلطان العلوم نے اپنی رعایا، کے ایک ممتاز طبقے کی ہر جھتی ترقی کے مد نظر اجازت عطا فرما کر سرفراز فرمایا -

نئے حیدر آباد کی نمایاں خصوصیات اس کی عالی شان عمارتیں ہیں - حیدر آباد براڈگیج کے اسٹیشن کا پلیٹ فارم انہی دلچسپیوں میں سے ایک ہے - سچ پوچھو تو یہ ہے کہ آنکھ والے کے لئے ہر اسٹیشن ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی ہے - کوئی آرہا ہے - کوئی جارہا ہے - اور جنہون نے وقت کی قدر نہ جانی وہ چھوڑ دے' گئے -

۲۲ - اپریل سنہ ۱۹۴۳ع کا دن تھا - گھڑی میں شام کے کہئے یا دن کے (کیونکہ قدرت گرما میں ڈیڑھ گھنٹہ دن بڑہا دیا کرتی ہے اب حکومت نے ایک گھنٹہ سوئی کے

کاٹے بڑھا دے) سات بجتے ہونگے۔ گرانڈ ٹرنگ اکسپرس کے چھوٹنے کا وقت ہے جانے والے سب ہی بے چین۔ اترنے والے بھی سب ہی بے چین۔ ایک ہنگامہ تھا۔ لوگ عجیب حالت میں تھے۔ کوئی ٹکٹ کٹانے بھاگتا تھا۔ کوئی بچہ سنبھالتا کوئی سامان تاکتا ہے کوئی صراحی اٹھائے جگہ ڈھونڈ تا ہے۔ کوئی کسی سے بچھڑنے کے لئے گلے مل رہا ہے۔ کوئی امام ضامن باندھتا ہے۔ کوئی زنانہ سوار کرانے دوڑتا ہے۔ کوئی بستر جماتا ہے۔ کوئی سامان گنتا ہے۔ کوئی قلی ڈھونڈ تا ہے۔ کوئی پیسے گنتا ہے۔ کوئی مہمان لینے آیا ہے۔ تو کوئی عزیزوں کو چھوڑنے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ جتنے سر اتنے سودے۔ جتنی زبان اتنی بولیاں۔ انگریزی۔ مرھٹی۔ تلنگی۔ کنڑی کو جانے دیجئے۔ اردو بھی کئی قسم کی بولی جاتی ہے۔ خان صاب بھی بول رہے ہیں اور چاؤش بھی۔ پنجابی بھی۔ ائیر بھی اور مدراسی بھی۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دوسری طرف چائے گرم۔ سنترے۔ چائے پان سگریٹ کے نعرے بلند تھے۔ گھنٹی بجی اور ساتھ ہی سیٹی بھی۔ اور ریل گاڑی پلیٹ فارم سے آلگی۔ ع:۔

"جائے تنگ است و مرد ماں بسیار" راجہ صاحب معز سکندر آباد سے سوار ہونے والے تھے۔ اور ہم یہیں سے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ دوستوں نے خدا حافظ کہا۔

سکندر آباد اسٹیشن پر آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر سیاون میں تشریف فرما ہوئے۔ پھول کے ہار پہنائے گئے۔ "بسلامت روی و باز آئی"۔ معتمد صاحب اسٹیٹ نے امام ضامن باندھا۔ اسی ٹرین سے حیدر آبادی برادری کے بہت سے نمائندے بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ راجہ پرتاب کرن بہادر۔ رائے ہربنس چند صاحب۔ رائے نرنارائن پرشاد صاحب۔ رائے ڈگمبر پرشاد صاحب و رائے ہر کشور صاحب و رائے سریرنگ پرشاد صاحب و رائے رگھو بیر بلی صاحب مندوبین تھے۔ مولوی حمید الدین محمود صاحب پرسنل مددگار و نائب معتمد تعمیرات اور پرسنل اسٹاف بھی ہمراہ تھا۔ دکن نیوز کے ایڈیٹر جناب مرزا امام بیگ صاحب رونق بھی ساتھ تھے۔ پولیس نے راجہ صاحب ذی وقار کو سلامی دی۔ برادری کے بہت سے سربر آوردہ حضرات کے علاوہ عہدہ داران سرکار عالی نے فخر قوم راجہ صاحب کو خدا حافظ کہا۔ ریل گاڑی مسرتوں

کے آغوش میں بڑھنے لگی - اس طرح اس سفر کا آغاز ہوا -

بستیوں سے دور ہوئے تو کلفت سی کم ہوئی - میدان، کھیت اور درخت گویا یہ تو ہمارے ساتھ چل رہے تھے اور تیز چل رہے تھے - بالآخر رات کی تاریکی نے اپنی سیاہ جھولی میں ان سب کو چھپا لیا - البتہ اب انجن کی چنگاریوں سے اشارے کرتے ہوئے تارے ہمارے ساتھ دوڑ رہے تھے - مگر ہماری نیند کی ماتے آنکھوں نے ہمیں ان سے بھی چھڑا کر میٹھے سپنے والی دنیا کی سیر میں محو کر دیا - جہاں امیر و غریب سب کی دنیا ایک سی ہے اس منزل پر تھرڈ اور فرسٹ کلاس سب کا منظر ایک تھا - "چہ بر تخت خفتن چہ برروئے خاک" - خدا نے آدمی بنایا اور آدمی نے امیر و غریب بنائے پھر قدرت نے انسان کو نیند کے گود سلا کر اس امتیاز کو مٹا دیا - جاگتی دنیا سے یہ سوتی دنیا کتنی اچھی ہے! یہ تو رہیں خواب کی باتیں - اب سائنس کا کرشمہ دیکھئے - سوتا بھی چل رہا تھا - اور جاگتا بھی چل رہا تھا - کوئی نہ چل رہا تھا پھر بھی سب چل رہے تھے - صبح ہوتے ہوتے ہم برطانوی ہند میں آگئے -

واردھا جنگشن پر گاڑی کافی عرصہ تک ٹھیری - یہ صرف ریلوے کا جنگشن ہی نہیں بلکہ یہاں مختلف مکاتب خیال کا مرکز بھی ہے - ایک انگریز سیاح نے اس مقام کو ہندوستان کا ایتھنز کہا ہے - مغرب میں آزاد خیال یونان کی راجدھانی ایتھنز ہے تو مشرق میں اس صدی کے ہندی فلسفیوں کا تیرتھ واردھا - یہاں مسافروں کو منہ ہاتھ دھو لینے کی فرصت ملی - چائے اور ناشتہ کا وقت بھی تھا - ہماری رفتار یہاں سے قدرے تیز ہوگئی تقریباً ۱۱ - بجے ناگپور پہنچے ناگپور سے گذرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ راستے کے دونوں طرف باغ ہی باغ ہیں - ہرے بھرے درختوں پر لال لال سنتروں کے قمقمے بھینی بھینی خوشبو عجیب سماں تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سنتروں کے تختے ہمارے ساتھ کئی میل تک چل رہے ہیں - اس موسم میں سنترے یہاں سے بہت دور دور بھیجے جاتے ہیں - ناگپور میں ایک یونیورسٹی بھی ہے - صوبہ متوسط کا صدر مقام ہے - یہاں برطانوی گورنر رہتا ہے اور دولت آصفی کا ایجنٹ برار بھی - پارچہ بافی کی صنعت کے کئی کارخانے ہیں - یہ مزدوروں کا شہر ہے -

اٹارسی سے پہلے ہی ریل میں ایک اور انجن لگا دیا گیا۔ یہاں سے بندھیاچل ست پڑا کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ چڑھائی کی وجہ سے ریل میں دو انجن لگائے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جتنی منزل کٹھن ہو اُسی نسبت سے سخت کوشی بھی کی جانی پڑتی ہے۔ ہماری کامیابی کی قدر،منزل کی دشواریوں سے معین نہیں بلکہ ہماری تدابیر و کوششوں کی نسبت سے قرار پاتی ہے۔ ان ہی دشوارگذار گھاٹیوں میں ہمارے اسلاف کس قدر جانکاہ مصایب اُٹھا کر پیدل سفر کرتے رہے ہوں گے؟ آمد و رفت کے موجودہ ذرائع دراصل انسانیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ ہمارے لئے کتنی سہولتیں موجود ہیں پھر ہم یہ کیونکر کہیں کہ ہم ترقی نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری ہر ایجاد ہمارے اجنبی ماحول سے ہمیں کسقدر ہم رنگ بنا رہی ہے اور آئے دن ہمارا قابو قدرت پر کس قدر شاندار طریقہ سے بڑھتا جا رہا ہے! ورنہ یہی گھنے جنگل تھے۔ یہی وادیاں تھیں، یہی نالے اور ندیاں تھیں جہاں پنڈاروں اور لٹیروں نے ہزاروں قافلوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ نقل و حمل کے جدید ذرائع امن و امان کے پاسبان ہیں۔ ریل جنگلوں اور دروں سے سنسناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ان دروں کے درمیان بھی اسٹیشن ہیں جہاں سے جنگل کی پیداوار میں لکڑی بر آمد کی جاتی ہے۔ انہیں جنگلوں میں قدیم اقوام آج بھی جدید ایجادات سائنس سے بے نیاز۔ قدرت کی گود میں بستی ہیں اور ان کی احتیاجات زندگی ویسی ہی محدود۔ ویسی ہی سادہ ہیں جیسی آریوں کے آمد سے پہلے تھیں۔

اٹارسی کا اسٹیشن تھا۔ یوں تو اس زمانہ میں گاڑیوں میں جگہ بہت کم ملتی ہے۔ فوجیوں کی نقل و حمل اور مسافروں کی کثرت نے بھی سفر میں ایک محشر برپا کر رکھا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ اٹارسی سے کئی لوگ بلا ٹکٹ سوار ہو گئے یہ سب غلہ لینے بھوپال جا رہے تھے۔ ان دنوں صرف وہیں غلہ ملتا تھا اگرچہ وہ بھی کافی نہیں تھا۔ گرانی سے عوام سخت پریشان تھے۔ پیٹ میں روٹی تھی نہ تن پر کپڑا۔ دل و دماغ مفلس کے چراغ تھے۔ مسافروں سے ہاتھ پیر پڑ کر صرف کھڑے رہنے کے لئے جگہ مانگ رہے تھے۔

مشرق و مغرب کے منحوس ڈیکٹیٹروں کا سایہ نحوست 'غریب' بھوکے اور ننگے ہندوستان کو، نحس کئے ڈال رہا تھا۔ کبھی قحط سالی میں بھی اس قدر گرانی نہیں ہوئی تھی۔ اس جنگ نے موت سستی کر دی اور زندگی مہنگی۔ نفع اندوزی کا برا ہو خدا نے

کافی دیا لیکن بندوں نے محروم کر دیا۔ دکھنی کہاوت ہے "خدا کا دیا سر تا نہیں بندے کا دیا رہتا نہیں"۔ مگر یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ فصلیں اچھی ہیں لیکن ملتا کچھ نہیں۔ حکومت اشیاء کا نرخ مقرر کر کے سرکاری گودام اور دکانیں قائم کر کے اور دیگر تجاویز اختیار کر کے اس بلائے بے درماں سے نجات دلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ اہل استطاعت آئندہ کی فکر میں منہ مانگے دام دیکر اتنا اندوختہ کر لیتے ہیں کہ غریب کو گراں خریدنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے اب ہر چیز مہنگی کیوں نہ ہو؟۔

یہ غریب مسافر کسی کے قدموں میں بیٹھ جاتے فوجیوں کو نربدا کا پرشاد یعنی رتالو اور اسی قسم کی دوسری جڑیں دے کر عاجزی کر لیتے۔ کسی فوجی کو ترس آ گیا تو اُس نے ایک آدھ آنہ دے دیا۔ غریب کی عید ہو گئی۔ اسی طرح بھیک مانگ کر غلہ خریدنے کے لئے پیسے جمع کر لیتے تھے۔ جب بھوپال اسٹیشن آیا تو یہ لوگ ریلوے والوں کے ڈر سے پلیٹ فارم کی دوسری طرف پیچھے کے راستے سے کود کر نکل گئے۔

جاگیر دارانہ نظام کی چاہے کتنی ہی مذمت کی جائے اور جاگیر دار کا گودام چاہے کسانوں کی فصلوں سے کتنا ہی معمور کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ بھوکے کی روٹی ننگے کی لنگوٹی تو نہیں کھینچتا۔ رعایا اس کی اپنی اولاد کی طرح ہوتی ہے۔ رعایا کی بھلائی جاگیر دار کی بھلائی ہے۔ دودھ دینے والی گائے کو چارہ بھی دینا پڑتا ہے۔ یہ بچھڑے کی طرح اپنی گائے کا دودھ تو پی لیتا ہے لیکن گوچڑی کی طرح خون نہیں چوس لیتا۔ یہ نظام پرانا ہی سہی اور یہ مانا بھی جائے کہ مساوات کے اجزا اس میں کم ہیں لیکن پھر بھی وہ سب کے لئے کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ اونچا نیچا تو ہوتا ہے مگر بھوکا اور ننگا اس نظام میں کوئی نہیں ہوتا۔

گئوپال گائے کے پالنے والے کو کہتے ہیں اور بھوپال زمین کے پالنے والے کو۔ بھوپال اپنے صحیح معنوں میں بھوپال ہے۔ برطانوی ہند کے باشندوں سے دیسی ریاستوں کی رعایا بہت اچھی حالت میں ہے۔ وہ ابھی اپنے بھوکے پڑوس کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دیسکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔

بھوپال ہمیں قریب قریب رات کے دس بجے ملا۔ بھوپال میں عمل تاریکی کا بھوت نہ تھا۔ جا بجا قمقمے جگمگا رہے تھے۔ بازار میں چہل پہل بھی کافی تھی۔ یہ بہت پرانی دیسی ریاست ہے۔

ریل چلتی رہی اور ہم بیٹھے رہے بلکہ اونگتے رہے۔ نہ سوئے نہ جاگے۔ کوئی تین بجے جھانسی پہونچے۔ یہ بڑا فوجی مرکز ہے۔ ہر ہندوستانی عورت کے لئے جھانسی ایک طلسمی منتر ہے جس کو سن کر مادر ہند کی ہر بیٹی ایک آزاد فضا میں سانس لینے لگتی ہے۔ رانی لکشمی بائی نے میدان جنگ میں وہ مردانہ جوہر دکھلائے کہ ہر مرد کا سر اس دیوی کی تعظیم میں جھک جائے گا۔ یہاں رائے بہادر کپٹن کالی سہائے نگم صدر مجلس استقبالیہ کے ایک نمایندے ملے جو راجہ صاحب معز کی پارٹی کے استقبال کے لئے آئے تھے۔ گویا صدر قوم راجہ صاحب ذی مرتبت کے استقبال کا انتظام اسی جا سے شروع ہوگیا۔ انہوں نے حیدر آبادی نمایندوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ زندہ قوم اپنے سردار کا سب سے زیادہ احترام کرتی ہے۔ بیدار اور ہوشمند طبقے کی یہی نشانی ہے۔ وہ اپنے رہنما اور رہبر پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے۔ یہاں ہم جی۔ آئی۔ پی۔ آر۔ سے ای۔ آئی۔ آر۔ میں منتقل ہوئے۔ راجہ صاحب معز کا سیلون پٹریاں بدل کر آلگا۔ اب ریل لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئی۔ کہتے ہیں لکھنؤ کا نام لکھن پور تھا۔ اودھ کے راج کمار رام کے بھائی لچھمن کے نام پر آباد ہے۔

دوسرے دن صبح یعنی ۲۴۔ اپریل ۱۱۔ بجے ریل کانپور پہنچی۔ کانپور ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے یادگار کی طور پر آباد ہے۔ جہاں ایک طرف تھکا ماندہ بھوکا مزدور اور دوسری طرف جوان بخت سرمایہ دار آپس میں کشمکش کر رہے ہیں۔ سربفلک چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ یہ عجیب منظر ہے۔ گنگا کا پل انسانی اولوالعزمی اور فن تعمیر دونوں نکتۂ نظر سے واحد نظیر ہے۔ پل کی تعمیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے یہ نظریہ مان لیا کہ بھائی تم بھی بہتے رہو اور ہم بھی چلتے رہیں نہ تم رکو نہ ہم رکیں۔ کانپور میں چمڑے۔ کپڑے اور ہتیار بنانے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ گنگا کے کنارے ایسی بڑی بستی نئے ہندوستان کی تعمیر میں بہت کار آمد ثابت ہوگی۔ یہ شہر بینکوں

کے اساس پر قائم ہے ۔ یہاں بھی فوجی چھاؤنی ہے ۔ شاہان اودھ کے زوال کے بعد یہ شہر روز بروز ترقی پر رہا ہے ۔ صنعتی ہندوستان کی تعمیر میں "ٹاٹا" کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا ۔ وہ ہندوستان کو یورپ کی جدید ترقی کے دوش بدوش چلانا چاہتے تھے ۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی فقط ہندوستان میں بڑی صنعتوں کو رواج دے کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے ۔ ان کا خیال تھا کہ گھریلو صنعتوں کے فروغ سے موجودہ مصائب حل نہیں ہو سکتے ۔ وہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر کو گلا سگو ۔ میانچسٹر بنانا چاہتے تھے ۔ انہیں ہندوستان میں صنعتی ترقی کے لئے غیر ملکی سرمایہ لگانے میں بھی عار نہ تھا ۔ کانپور کی موجودہ صورت ، انہیں کے خواب کی ایک تعبیر ہے ۔ موجودہ جنگ کے بعد ، جدید نظام غالباً ان کی ڈالے ہوئے داغ بیل پر ہی تعمیر ہو گا ۔

۲۴ ۔ اپریل دن کے ایک بجے شاہان اودھ کے پایہ تخت لکھنؤ پھونچے ۔ چار باغ ریلوے اسٹیشن پر راجہ صاحب معز کا پر جوش استقبال کیا گیا ۔ ٹولیوں کی ٹولیاں راجہ صاحب معز کی سیلون کی طرف دوڑ آئیں ۔ منشی جی ۔ بابو جی ۔ یہ لالہ بھائیوں کے جھنڈ تھے جو اپنے محترم صدر کا استقبال کرنے بڑھ رہے تھے ۔ مختلف اداروں کی جانب سے بھی استقبال کے لئے نمائندے آئے تھے ۔ ان سب لوگوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے ان سے عقیدت برس رہی تھی ۔ مجلس استقبالیہ کے صدر رائے بہادر ڈاکٹر کالی سہائے نگم ۔ بابو بشمبر ناتھ صاحب معتمد استقبالیہ و ارکان استقبالیہ کے علاوہ آگرہ ۔ الہ آباد ۔ کانپور ۔ دہلی اور حیدر آباد وغیرہ کے بہت سے سربر آوردہ مندوبین کانفرنس خیر مقدم کے لئے منتظر تھے ۔ رضا کاروں کے دستے الگ پرے جمائے کھڑے تھے ۔ ارکان استقبالیہ اور مندوبین سے راجہ صاحب ممدوح کا تعارف کرایا گیا ۔ کثرت سے پھول پہنائے گئے ۔ تصویریں لی گئیں ۔

"راجہ دھرم کرن کی جئے" کے نعرے لگائے گئے ۔ صدر عالی مقام کا جلوس ان فلک شگاف نعروں کی گونج میں چار باغ سے باہر نکلا ۔ ایک خوب صورت موٹر سجی سجائی دلہن بنی باہر کھڑی تھی ۔ جو صدر ذی مرتبت کو لے کر راجہ صاحب اویل کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئی ۔ راجہ یوراج دت سنگھ صاحب اویل لکھنؤ کے قدیم جاگیردار ہیں ۔ آپ کے بڑے علاقے ہیں ۔ بڑی زمینداری ہے ۔ اس رئیس کی سالانہ آمدنی (۱۲) لاکھ سے کچھ کم نہیں ۔ یہ



حارباع ریلوے اسٹیس (لکھنو) در
عالیجاب راجہ صاحب ممدوح اسان کا برحوس اسمال



صدر قوم قیصر باغ کی بارہ دری میں
(جہاں آل انڈیا کا ستہ کانفرنس کا چوالسواں اجلاس ہو رہا ہے)

ٹھاکر ہیں - راجہ صاحب اویل غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں - اور عوام میں بہت مقبول اور ہر دل عزیز ہیں - آپ کی داد و دہش کے بہت سے قصے مشہور ہیں - غریبوں کی شادی کرادی - محتاجوں کو زراعت کے لئے زمین دی - بے روزگاروں کو روزی سے لگایا - سنا ہے خیرات بہانے ڈھونڈتی ہے - جو مانگتا ہے وہ پاتا ہے - اس در سے کوئی مایوس نہیں جاتا - تواضع آپ کی امتیازی خوصیت ہے - دورمغلیہ کے ہندو راجگان کی زندہ یادگار ہیں - آپ کی کوٹھی جس میں راجہ صاحب ذی مرتبت مہمان تھے دریائے گومتی کے بالکل کنارے پر ہے اور بہت سے خوب صورت مناظر اپنی گود میں رکھتی ہے - دریائے گومتی کی لہریں اس محل کی سیڑھیوں کو ہر روز آکر دھو جایا کرتی ہیں - سامنے لکھنو یونیورسٹی کی عمارت ہے - اور بازو عجائب گھر - تواضع و مہمان نوازی کا یہاں ہر طرح انتظام تھا - ملازمان کوٹھی بھی خدمت کے لئے ہر وقت تیار تھے - مجلس استقبالیہ نے اپنے دیگر مہمانوں کو کرسچین کالج میں ٹھیرایا تھا - ہم اپنے گھر سے بہت دور تھے لیکن اب سارا ہندوستان ہمارا گھر تھا - محدود برادری کا تنگ دائرہ یہاں بہت وسیع معلوم ہوتا تھا - دریا سمندر میں آملی تھی -

کانفرنس قوم کے منتخب افراد کا ایسا اجتماع ہے جو قوم کی مادی - ذہنی و اخلاقی ترقی کے وسائل دریافت کرے اور انسان کی تخلیقی قوتوں کو نشو و نما ، اس کے قوائے ذہنی کی اعلی تربیت، اس کے معاشرتی شعور کی افزائش، سیاسی احساس میں بیداری کے تجاویز مرتب کرے - جس پر قوم عمل پیرا ہو کر بین الاقوامی رفاقت و اتحاد کی بنیادوں پر قومی (آرٹ اور کلچر) فنون و ثقافت کے ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکے - اور ایسا نظام العمل مرتب کرے کہ قوم اپنی کمزوریوں اور نقائص کو دور کرنے کے قابل بن سکے - امتداد زمانہ سے سماج میں، رسم و رواج میں، ہمارے ضابطوں اور قاعدوں میں ایسی اسقام پیدا ہو جاتے ہیں جو بالآخر ہمارے لئے موت کا پیغام دیتے ہیں - اس لئے ان کی بروقت اصلاح ضروری ہے - ورنہ یہ چھوٹے چھوٹے رخنے ہماری سماج کی کشتیوں کو تہ آب کر دیتے ہیں -

کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ میں منعقد ہوا - شہنشاہ ہند کو بھی شاہ جرمن کی طرح قیصر

لکھتے ہیں ۔ واجد علی شاہ رنگیلے اس خوبصورت باغ کو بہت پسند کرتے تھے ۔ یہی باغ اندر سبھا کا مقام تھا ۔ چاروں طرف بیگمات کے پیلے پیلے محلات ہیں ۔ مغلیہ دور کا سب سے کامیاب فن تعمیر کا نمونہ نہریں ۔ آبشار اور فوارے آج بھی اسی طرح موتی بکھیر رہے ہیں ۔ بارہ دری بھی اپنی آپ مثال ہے ۔ کہا جاتا ہے ہندوستانی فن تعمیر میں یہ نمونہ ایران سے ماخذ ہے ۔ کانفرنس کا اجلاس اسی جگہ ہو رہا تھا ۔ ۲۴ ۔ اپریل سنہ ۱۹۴۳ عیسوی کے ۴ بجے شام اجلاس کا آغاز ہوا ۔ قیصر باغ کی بارہ دری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۔ مختلف صوبوں کے کایستھوں کا اجتماع نئی تہذیب کا امتزاج بن رہا تھا ۔ تالیوں کی گونج میں آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے ۔ بابو بشمبر ناتھ سری واستو معتمد عمومی سنہرے زری کے ہار راجہ صاحب صدر قوم اور صدر استقبالیہ کے زیب گلو کئے ۔ راجہ صاحب ذی مرتبت کے سر پر دستار آصفی لکھنو کی نگاہ شوق کا مرکز بنی ہوئی تھی — می تافت ستارۂ بلندی — آپ کی دستار آصفی دیکھ کر حضرت بندگان عالی حضور نظام کا اسم گرامی لکھنو کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر آگیا ۔ اہل لکھنو نے دستار آصفی سے محبت اور عقیدت و دلچسپی کا اظہار کر کے اس عقیدتمندانہ جذبات کا ثبوت دیا جو ان کو تاجدار دکن کی ذات ھمایونی سے ہے ۔ ان دنوں لکھنو میں آپکی موجودگی سے حیدرآباد اور تاجدار سلطنت آصفیہ کا ذکر ہر محفل میں اور ہر مجلس میں ہر شخص کی زبان پر ہوتا رہا ۔ آنریبل راجہ صاحب بہادر کی شخصیت نے لکھنو میں بہت جلد ہمہ گیر مقبولیت حاصل کرلی ۔ آپ کا علمی شوق اور امیرانہ شان و شوکت سے لکھنو میں حیدرآباد کی نسبت جو روایات مشہور ہیں اس پر مہر تصدیق ثبت کردی ۔ آپ نے (۱۵۷) روپے کا گران قدر عطیہ عطا فرما کر کانفرنس کی بنیادیں مضبوط فرمادیں ۔

خطبہ استقبالیہ کے جواب میں تالیوں کے گونج کے ساتھ آنریبل راجہ صاحب بہادر نے خطبہ صدارت پڑھا ۔ اڈریس کے آگے ہی صحافتی نمائندوں کی نشست تھی ۔ دہنے ۔ بائیں مندوبین اور مہمان تھے ۔ نسوانی مندوبین کی موجودگی اس طبقے کی ہر جہتی ترقی کی کافی ضمانت ہے ۔ قدیم ہندی تمدن میں جدید تعلیم اصلاح اور رد اصلاح کی راہ میں یہ دیویاں مشعل راہ ہیں ۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس کوئی ۸ بجے ختم ہوا ۔ بارہ دری سے پلٹتے ہوئے ہر شخص کی زبان سے خطبہ صدارت کے مختلف جملے ورد ہو رہے تھے اور یہی ان کی گفتگو کا موضوع

بنا ہوا تھا۔ ان میں تنقید، رد و قدح، تکرار و بحث تھی تو بس یہ کہ کوئی کہتا تھا کہ جملہ تو بس وہ تھا۔ دوسرا کہتا تھا کہ اماں وہ نہیں ضروری بات تو یہ تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ کیا بات کہی ہے۔ اس نصیحت پر قوم عمل کرلے تو بیڑا پار ہے۔ کوئی کہتا زبان بڑی اچھی ہے۔ کوئی کہتا تھا معلومات بہت ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ بڑا نباض ہے۔ مرض پہچان لیا۔ کوئی کہتا تھا "ترک رسوم۔" کوئی کہتا تھا "ادب اور شاعری" تو کوئی "قومی اسٹور اور جنگ۔" غرض اس طرح مجمع سراہتے ہوئے جاتا تھا۔ رات گئے سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس برخاست ہوا۔

خلوص دل سے پائی فتح کامل عزم والوں نے
میانوں میں تڑپتی رہ گئیں اعدا کی شمشیریں

دوسرے دن ۲۵ - اپریل کو پھر کھلے اجلاس شروع ہوئے۔ مفید قومی تحریکیں منظور کیں۔ راجہ بہادر کے اعزاز میں قصیدے پڑھے گئے۔ باکسینگ اور دیگر مردانہ کرتب کا بھی مظاہرہ ہوا۔ اس کے بعد سیتاپور کے رئیس سیٹھ جنی نارائن سری واستو نے کثیر مہمانوں کے ساتھ مندوبین کو مدعو کیا اور بڑے تکلف سے تواضع کی۔ ہم دکھنی اس لکھنو کی دعوت کو نہ ٹوٹنے والے سمبندھ کی ضیافت کہتے ہیں۔

دوسرے روز مقامی مصروفیات تھیں۔ ڈاکٹر نگم نے راجہ صاحب عالی مقام کو ظہرانہ پر مدعو کیا۔ اسی دن راجہ صاحب عالی مقام نے متعدد اداروں کا معائنہ بھی فرمایا۔ ہر گوبند دیال کایستھ سوسائیٹی لکھنو نے ایک جلسہ ترتیب دیا تھا جس میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے، راجہ صاحب اور ان کے اسلاف نے سلطنت حیدرآباد کی جو خدمات انجام دی ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس ادارے کو راجہ صاحب ذی مرتبت نے (۲۰۰) روپے کا گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا۔ شام میں کایستھ پاٹ شالہ اور کایستھ انسٹیٹیوٹ کی جانب سے جلسے اور عصرانے ترتیب دے گئے۔ اور سپاسنامے پیش کئے گئے۔ جواب میں کایستھ پاٹ شالہ کو (۳۰۰) اور کایستھ انسٹیٹیوٹ کو (۵۰۰) روپے کا عطیہ مرحمت فرماتے ہوئے، آنریبل راجہ صاحب بہادر نے فرمایا کہ تاجدار دکن کی کایستھوں پر بے حد نوازش ہے۔ مجھے حضور اقدس و اعلی نے اجازت دے کر آپ کے اداروں کے معائنہ کا موقعہ عطا فرمایا۔

اویل پیالیس پر کثرت سے معزز ملاقاتی مشرف ہوتے رہتے۔معززاصحاب برادری کے علاوہ دیگر عہدہ داران مقامی کا بھی ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔راجہ صاحب معزسے جو بھی ملتا۔آپ کے اوصاف اس کے ورد زبان رہتے تھے۔انہیں کا مالاجپتا تھا۔راجہ صاحب معزجس سے بھی ملتے اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ہر شخص آپ کے قدیم خاندانی وجاہت، وسیع اخلاق اور بادشاہ پرستی کی تعریف کرتا۔کوئی کہتا کہ راجہ صاحب ممدوح سے مل کر دربار مغلیہ دور کے امرا یاد آتے ہیں۔"واللہ دربار اکبری کے ھندو امراء کا نقشہ آج اپنی آنکھوں دیکھ لیا"۔

۲۷۔اپریل کی صبح (۹) بجے بھی برادری کے اصحاب نے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

جناب قاضی عبدالغفار صاحب مدیر روزنامہ پیام حیدرآباد نے جو ان دنوں لکھنؤ میں مقیم ہیں راجہ صاحب عالی مقام کو ظہرانہ پر مدعو کیا۔قاضی صاحب دنیائے صحافت کے ترقی پسند قوم پرستوں کی صف میں بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔آپ صحافت کی کوئی دس برس سے مسلسل کامیاب خدمت کر رہے ہیں۔آپ کی ادبی کاوشیں محتاج تعارف نہیں۔"لیلی کے خطوط"۔"مجنون کی ڈایری"۔"تین پیسے کی چھوکری"— جدید اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ ہے۔آپ کا اداریہ مدلل اور معلومات افروز آپ کا سرراہ مزاحیہ اور پر لطف تنقید ہوتی ہے۔یہاں ملک کے لایق پروفیسر و شعرا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے چانسلر صاحب اور بہت سے ادیب مدعو تھے۔شام میں رائی بشیشورناتھ نے راجہ بہادر کی ایک پر تکلف ہندوستانی ضیافت کی۔حیدرآبادی مندوبین بھی مدعو تھے۔

صبح بنارس اور شام اودھ ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔"مگر وہ اگلے وقتوں کی بات کہاں۔"امیر الامراء کا کتب خانہ۔چھتر منزل۔عجائب گھر تو"صنادید" رہ گئے ہیں۔ بنارسی باغ، بھول بھلیاں اور امین آباد پارک میں آج بھی رنجیدہ دل بہل جاتا ہے۔ حسین آباد نئی عمارتوں کی بستی ہے۔راجہ صاحب ذی مرتبت امام باڑہ دیکھنے تشریف لیگئے۔ امام باڑہ لکھنؤ ہی کی کیا بلکہ سارے دنیا کے لئے اہم مقام ہے۔اس کو اسلام میں ایرانی اثر سمجھا جاتا ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد شہدائے اسلام پر ہے۔اصول سے زیادہ اہم کردار ہے۔اسلام نے اصول پیش کردئے۔اور امام نے مرتبہ شہادت حاصل کرکے

نمونہ عمل پیش کیا۔ اسلام میں ایثار اور قربانی ہی اس کی روح رواں ہیں۔ سنہ ہجری کی ابتدا ماہ محرم سے ہوتی ہے۔ جو شہادتوں کا سبق دیتا ہے۔ اور سنہ ہجری کا آخری مہینہ بھی عید قرباں کا ہے جو راہ خدا میں قربانی کا حکم دیتا ہے۔ امام باڑہ بھی اِسی نصب العین کی یادگار ہے۔

لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ ہی نہیں زبان کی ٹکسال سے الگ بازار کی چہل پہل کا عالم نرالا ہے۔ زندہ دلی کی کیفیت یہ ہے کہ مجنوں نے دشت کی خاک اڑانی چھوڑ دی اور لیلیٰ نے محمل۔ ادھر منچلے "لیلیٰ کی انگلیاں۔ مجنوں کی پسلیاں۔ میٹھی میٹھی ککڑیاں" بیچتے اور خریدتے پھرتے ہیں۔ نئے شکر کو کاٹ کر عرق گلاب چھڑک کر بیچتے ہیں۔ تفریح کے لئے بقول نظیر اکبر آبادی کے۔

بن تاروں تار ملاتے ہیں، تب نرت نرالا کرتے ہیں
بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں، بن کھڑے گت بھرتے ہیں
جس گت پران کا پاؤں پڑا، اس گت کی چال نرالی ہے
جس محفل میں وہ ناچے ہیں، وہ محفل سب سے خالی ہے
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے ساچے ہیں
جو بے گت بے سرتال ہوے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

لب و لہجہ میں، چال ڈھال میں، کھانے پینے میں، غرض ہر جگہ نزاکت کے انداز غضب ہی توڑھاتے ہیں۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قلب شہر میں واقع ہے۔ جو اپنی مخصوص نشریات کی وجہ سے ہندوستانی ادبی حلقہ میں مقبولیت کا ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کے روپک۔ مشاعرے۔ موسیقی۔ دیہاتی پروگرام ہندوستان بھر میں شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس کا فنی سلیقہ، حسن جدت اور ہنر مندی سے معمور پروگرام قابل داد ہوتے ہیں۔ غالباً لکھنو کی خاک میں فنون لطیفہ کی پرورشی کا عنصر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ موسیقی نے بنگال میں جنم لیا اور اودھ میں جوان ہوئی۔ اب ہم اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اس جوانی کو یہاں کے ریڈیو اسٹیشن نے سنگھار کر خوب نکھارا ہے۔

چوک میں سونے چاندی کے ساتھ منڈھے پر بیٹھی لکشمی بھی بکتی ہے۔ بازار میں ساھو سے زیادہ چور اور چور سے زیادہ دلالوں کا اثر ہے۔ یہ بھی اپنے زمین میں بڑے نازک نازک خیال رکھتے ہیں۔ عطریات لکھنؤ کی خاص صنعت ہے۔

غرض ۲۷۔ اپریل ہم لکھنئو سے الہ آباد روانہ ہوئے کایستھوں کا ایک بڑا اجتماع جو دیگر مقامی عہدہ داروں پر بھی مشتمل تھا، راجہ صاحب ذی مرتبت کو خداحافظ کہا۔ ۲۸۔ اپریل کی صبح آفتاب کی سنہری کرنوں کے ساتھ الہ آباد پہونچے ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر گوکل چند پرنسپل کایستھ پاٹ شالا راجہ صاحب بہادر کے خیر مقدم کے لئے پلیٹ فارم پر تھے۔

گنگا جمنا کا سنگم۔ تربینی پریاگ میں اشنان پر لطف تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہندوستان میں قدرت برہنہ پوجی جاتی ہے۔ یہ بے شک سچ ہے۔ ہمالیہ کے برفستانی کیلاش کی چوٹیاں، ناگے کے ننگے پربت، گنگا کا مقدس نرمل جل اور دودھاری گئو ماتا کیوں نہ پوجی جائیں۔ یہ رہتی دنیا تک پوجی جائینگی اور جب تک گنگا بہتی رہیگی بھاگیرت کا نام زندہ رہیگا۔ الہ آباد میں گنگا جمنا کا سنگم، آج بھی اس پر بسنے والی قوموں کے لئے اتحاد کا نصب العین پیش کرتا ہے۔ راجہ صاحب معز نے الہ آباد کایستھ پاٹ شالا کا معائنہ فرمایا۔ یہ مشہور ہے کہ یہاں کا قلعہ راجہ اشوک کے زمانے میں بنایا گیا ہے۔ آنند بھون، سوراج بھون اور کملا میموریل ہاسپٹل بھی قابل دید ہیں۔ یہاں آکر گنگا جمنا کی روانی تو کم ہوگئی لیکن برہمنوں۔ پانڈوؤں کا خوب زور ہے۔ بہتی گنگا میں عقیدت مندوں کو ہاتھ دہلاتے ہیں۔ ان کا اس دنیا میں اور اُس دنیا میں یہی ذریعہ ہے۔ یہ قدیم وضع کا شہر ہے۔ اس کے بازار، گلی کوچہ اور رسم ورواج سب ہی قدیم ہیں،۔

۲۹۔ اپریل کی صبح ۹ بجے الہ آباد سے مرزا پور پہونچے۔ مرزا پور سے ٦ میل کے فاصلے پر بندھیاچل کی دیوی کا تاریخی مندر ہے۔ ہندووں کی دیومالا (صنمیات) میں طاقت کو تین تشبیہوں میں بیان کیا ہے۔ علم۔ دولت اور قوت۔ انہیں کو سرسوتی۔ لکشمی اور شکتی کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سرسوتی کے چار ہاتھ ہیں جو فوق الفطرت طاقت کا نشان ہے۔ وہ سنگلاخ زمین پر جنگل میں بیٹھی ہے۔ حصول علم فولاد کے

چنے چبانا ہے۔ وہ دشوار گذار گھاٹیوں میں شور و شغب سے دور ہی میسر آسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وینا دی گئی ہے۔ جو موسیقی اور شاعری کی علامت ہے۔ ایک ہاتھ میں مالا ہے۔ جس سے علم ریاضی مراد ہے۔ اور دوسرے میں کتاب جو رسم التحریر کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے اس کا پسندیدہ جانور مور ہے۔ یہی شاعری کی تعریف ہے۔ بلند پرواز خیالات کی خوبصورت الفاظ میں نمائندگی یہی پرندہ کرسکتا ہے۔ سرسوتی کا لباس بھی سپید ہے جو پاکبازی اور امن سرور کی نیابت کرتا ہے۔ اور اسی طرح لف ونشر کی زبان میں دولت کی دیوی کو پانی میں کنول پر بے ثبات کھڑا کیا گیا اور دو ہاتھ اس طرح ظاہر کئے کہ جس سے دین لین ظاہر ہوتا ہے۔ اور باقی دو ہاتوں میں کنول کے پھول دے گئے جو سطح آب پر بے ثباتی کی بے نظیر تصویر ہے۔ لکشمی کا پسندیدہ جانور ایراوت ہاتھی ہے۔ یعنی سپید۔ نادر الوجود ہے۔ اور یہی دولت کی شرط ہے کہ آلہ مبادلہ اپنی ندرت وکمیابی کی وجہ سے اپنے میں ثبات قدر بھی رکھتا ہو۔ اس دیوی کا لباس سرخ ہے جو خون و خطرے کی نشانی ہے۔ اس کی مرغوب سواری اُلو ہے۔ یہ ہر چمکتی چیز اپنے گھونسلے میں رکھ لیتا ہے۔ کفایت شعاری اور پس اندازی سے ہی بدنصیبی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ الغرض استعارے کی زبان میں شکتی کی تصویر بھی اسی طرح کھینچی گئی ہے کہ اس کے ہزارہا ہاتھ ہیں۔ برق اس کا ہتیار اور غصہ اس کا وصف ہے۔ منڈیوں کی مالا اس کا زیور سنگھار ہے۔ اور شیر اس کی سواری۔ اس کے ظہور کے لئے وقت، مقام اور مخاطب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ قتل۔ خون۔ غارت گری اور آتش فشانی اس کے دلچسپ مشغلے ہیں۔ دئیت (راکشش) یعنی امراض اور نقائص کا خاتمہ کرتی ہے۔ بندھیاچل کی دیوی اسی شکتی کی مظہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کنس کے مظالم سے جب معصوموں کے قتل سے خون بہنے لگا تو یہ قہر الہی کی دیوی بہ شکل برق ظاہر ہوئیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اولوالعزمی اور ارادہ اس دیوی کی سادھنا سے انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ بت تراشی کے پس پردہ انسانی جذبات کی ترجمانی تھی۔ اسی لئے یہ فنون لطیفہ میں داخل ہے۔ تکرار خیال سے استقرار عزم پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

راجہ صاحب بہادر بندھیاچل کی دیوی کے درشن کو تشریف لے گئے۔ مسٹر گابس ہل ڈسٹرکٹ کلکٹر نے موٹر کی سواری کا انتظام کیا تھا۔ شام میں واپسی ہوئی۔ یہاں سے علی گڈھ روانہ ہوئے۔

۳۰- اپریل کے ۹ بجے دن علی گڈھ پہنچے - مسلم یونیورسٹی کے عہدہ دار - پروفیسر اور طلباء کی بڑی تعداد نے آنریبل راجہ صدرالمہام بہادر کا پرتپاک خیر مقدم کیا - استقبال کرنے والوں میں نواب زادہ فرحت سعید خان فرزند نواب صاحب چھتاری صدر اعظم باب حکومت دولت آصفیہ بھی تھے - راجہ صاحب معزز کی رہائش کا انتظام نواب صاحب چھتاری کی کوٹھی پر تھا - یہ بالکل مشرقی وضع کی ہے - ساز و سامان کے آرائش سے مشرقی ذوق ظاہر ہوتا ہے - اس کی ہر چیز سے مشرقیت ٹپکتی ہے -

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں اپنا اہم درجہ رکھتی ہے - سولہویں صدی عیسوی کے یورپ میں علوم قدیم کی تحریکیں زور پر تھیں - اُنیسویں صدی کے ہندوستان میں بالکل وہی کیفیت رہی ہے - آئے دن جدید علوم کی تحقیقات اور سائینس کی بڑھتی ہوئی ایجادیں اور نت نئے کل پرزوں کی اختراع نے صنعتی دنیا میں ایک دھوم مچا رکھی تھی - دوسری طرف قدیم ادب کے احیا، و تجدید کا جوش اُمنڈ رہا تھا - اصلاح اور رد اصلاح میں ایک تصادم تھا - انقلابی آندھیاں پوری قوت کے ساتھ چل رہی تھیں - قدامت پرستی " قطب از جا نمی جنبد " کا مصداق تھی - کورانہ تقلید اور آزاد خیالی میں مقابلہ تھا - جذبہ تقابل میں ترقی پیدا ہوتی ہے - ایسے مسموم فضا اور تاریک ماحول میں ایسے قائد و رہبر کی ضرورت ہوتی ہے - جو حالات کے موازنہ سے قوم کے مرض کی تشخیص کرے اور علاج ہو سکے - جرمنی میں لوتھر، فرانس میں روسو، اسکاچستان میں جان ناکس اور انگلستان میں ہربرٹ اسپنسر نے جو خدمات انجام دئے وہی خدمت راجہ رام موہن رائے اور سرسید نے ہندوستان میں کی ہے - ہندوستان میں یہ مسلہ بہت اہم تھا کہ تعلیم انگریزی میں دی جائے یا عربی و سنسکرت میں - مکالے صرف انگریزی میں تعلیم دلانا چاہتا تھا - ویلزلے اور وارن ہیسٹنگ کا خیال تھا کہ ملکی زبان میں تعلیم ہو - ویلزلے کو کامیابی ہوئی - سرسید کی محنتیں آج علی گڈھ کی ہی شکل میں ہمارے آگے نہیں ہیں بلکہ اسی کے طفیل ہزارہا تعلیم یافتہ مسلمان نئے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہیں - یہاں لیٹرلیٹو سرسید اپنے بیٹے - پوتے اور رفیق کے ساتھ آج بھی علی گڈھ کی ترقی کی نگرانی کر رہے ہیں -

مسلم یونیورسٹی کی جانب سے راجہ صاحب ذی مرتبت کے اعزاز میں منٹو پارک

میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔ علی گڑھ کے روسا۔ پروفیسر۔ اکابر اور ممتاز شہری شریک تھے۔ اس علمی صحبت میں دو گھنٹے تک مختلف علمی موضوعات زیر بحث رہے۔

یہاں ایک موہن ہاسپٹل آنکھوں کے علاج کے لئے مخصوص ہے۔ اندھوں کی دنیا آنکھ والوں کی بنادی جاتی ہے۔ کتنے ہی سورداس اور کتنے ہی ملٹن ہیں ؎

ہزاروں گوہر شہوار ایسے بھی رہے ہونگے
کہ جن کی خوبیاں مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی

راجہ صاحب عالی مقام نے بھی اس ہاسپٹل کا معائنہ فرمایا۔ وارڈز میں گھومتے ہوے مریضوں سے بات چیت کرتے جاتے تھے۔ ہمدردی کے دو لفظ بھی مریض کے لئے دوا سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ راجہ صاحب معز کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ دواخانے کی رپورٹ و کارگزاری کا بھی اظہار اطمینان فرمایا۔ اس کے بعد کایستھ پاٹ شالہ علی گڈھ کا بھی معائنہ فرمایا۔

نواب صاحب چھتاری کی کوٹھی میں ایک پر تکلف عشائیہ ترتیب دیا گیا۔

اس شہر کی سڑکیں تنگ ہیں لیکن شہر والوں کے دل وسیع اور مضبوط اور بہتر وضع کے قفلوں کی صنعت مشہور ہے۔

علی گڈھ سے پہلی مئی کو نکل کراسی روز دہلی آپہونچے۔ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دہلی کا ریلوے اسٹیشن، ہندوستان کے پایہ تخت کے شایان شان ہے۔ اسٹیشن پر راجہ صاحب معز کے احباب اور نظام پیالیس کا عملہ اور اسٹیشن کے باہر حیدرآباد اسٹیٹ کار منتظر تھی۔ راجہ صاحب معز کا پر خلوص استقبال کیا گیا۔ نظام پیالیس میں قیام رہا۔

کوروں اور پانڈووں کا ہستناپور نیست ونابود ہوگیا۔ مغلوں اور سیدوں کی دلی بھی تو اجڑ گئی۔ البتہ سنا ہے کہ محققین کو نادری قتل عام کے انسانی خون کے داغ دھبے آج بھی آثار قدیمہ میں ملتے ہیں۔ اور کہیں کہیں سنہ ۵۷ع کے خونی نشانات بھی۔ حضرت امیر خسرو کا "بسنت کا رنگ" ہے اور نہ غالب کے "پھول والوں کی سیر"۔ ہاں حضرت

نظام الدین اولیا کا دربار ہر وقت لگا رہتا ہے ۔ اس خاک سے لوگ آج بھی فیض پاتے ہیں۔ عرفی کا "شربت نار" ہے اور غالب کے "سر بہ مہر گلاس"۔ اب دلی غالب کی دلی نہیں رہی۔ یہاں کی پرانی عمارتیں ہمیشہ کے لئے سونی ہو چکی ہیں ۔ اور جو رہ گئی ہیں وہ زمانہ کے اقتضاء سے اپنا روپ بدل چکی ہیں ۔ ایک لطیفہ یہ ہوا کسی نے کہا "غالب بہ یک وقت فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی"۔ میں نے کہا "غالب بہ یک وقت ولی بھی تھے اور بادہ خوار بھی"۔

پرانی دلی ڈھل گئی۔ در و دیوار پہ اُگ آیا ہے سبزہ غالب۔ مگر نئی دہلی بلکہ خوبصورت دہلی مغربی وضع و قطع میں ڈھل رہی ہے ۔ سارا شہر ایک خانہ باغ ہے ۔ راجہ مہاراجوں کی کوٹھیاں پر رونق ہیں۔غریب "بیابان" میں ہیں اور اس "گھر میں بہار آئی ہے"۔ ٹانگے والے نے کہا "حضور چالیس کروڑ کالے ہندوستانیوں کے گورے حکمران یعنی لندن کے بڑے لاٹ یہیں رہتے ہیں ۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر کا یہ مستقر ہے ۔ یہاں کونسل ہال ہے اور برلا مندر بھی۔

ہماری زبان کو قلعہ معلیٰ سے خاص تعلق رہا ہے ۔ اب جامعہ ملیہ بھی اردو ادب کی جو خدمت انجام دے رہی ہے وہ فرانس کے مجلس علمی کی خدمات سے کچھ کم نہیں ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی حالت اس شعر میں بیان کی گئی ہے ؎

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

لال قلعہ بھی قابل دید ہے لیکن داخلہ ذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے ۔ بہت سی نفیس چیزوں کی یہاں نمائش کی گئی ۔ ہندی فنون کے اعلیٰ نمونے اپنے کاریگروں کی یاد میں ساکت ہیں ۔ مرمریں شہنشاہی تخت بھی اپنے بادشاہ کے بغیر سونا رکھا ہے ۔ سنگ مرمر کی مورتیاں اپنے بنانے والوں کی تعریف میں گونگی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ بولنا ہی چاہتی ہیں۔ قطب مینار کو فن تعمیر سے زیادہ تاریخی اہمیت حاصل ہے ۔ جامع مسجد نمازیوں کے اجتماع کی واحد یادگار ہے ۔ آزاد میدان کے علاوہ کئی خوبصورت پارک بھی ہیں ۔ یہاں کا لباس لکھنؤ کے لباس سے جدا۔ وضع قطع بھی نرالی

لب و لہجہ بھی بالکل بدلا ہوا۔ زبان اور بولی بھی الگ۔ حکومت نہ دلی میں ہے نہ اودھ میں۔ لیکن ان کے امتیازمیں فرق نہیں آیا۔ بارونق بازاروں میں گھنٹہ گھر۔ بلی ماران۔ چاندنی چوک بہت مشہور ہیں۔

راجہ صاحب عالی مقام کے ساتھ آپ کا خاندان بھی سفر کر رہا تھا۔ راجہ محبوب کرن بہادر آصفجاہی بھی کشمیر سے یہاں آملے۔ آپ راجہ صاحب عالی مقام کے برادر عزیز ہیں اور آپ دور آصفیہ کے ہندو راجگان کی صف اول میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

تیسری مئی صبح دہلی سے بمبئی روانہ ہوے۔ راستے میں آگرہ ملا۔ وقت کی قلت سے ہم یہاں اتر نہ سکے۔ تاج محل عجائبات دنیا میں سے ایک ہے۔ یہ کس قدر سچ ہے۔ ع

حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

یہ کس قدر صحیح ہے کہ حسن ہمیشہ مسرت بخش ہے۔ جب کہ خود حسن موسم بہار کا ایک عارضی کرشمہ ہے۔ مگر عشق کے حسن کاروں نے شاہ جہاں کی محبت ممتاز محل کے حسن کو بھی دائمی حسین بنا دیا۔ یہ حسن و محبت کی خوبصورت یادگار تاج محل بہتی جمنا کے کنارے رہتی دنیا تک رہے گی۔ اور محبت کے پرستاروں سے خراج تحسین لیتی رہے گی۔

۴۔ مئی کو وکٹوریا ٹرمینس پہنچے۔ قصر شاہی جو ملا بار پر واقع ہے بہت خوبصورت ہے۔ اس کی گود میں سمندر ٹھاٹیں مارتا ہے۔ راجہ صاحب ذی مرتبت یہیں مقیم رہے۔ بمبئی ہندوستان کی ایک مصنوعی بندرگاہ ہے۔ غیر ملکی تجارت کی یہ واحد منڈی ہے۔ کپڑے کے صنعتی کارخانوں کا بھی یہی مرکز ہے۔ اسے ہندوستان کا لیورپول و مانچسٹر کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہاں کی آبادی میں عجیب تنوع ہے۔ قسم قسم کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں اور وضع قطع کی بوقلمی ایک نئی تہذیب کا بیج بو رہی ہے۔ یہاں یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا دو حصوں میں بٹ رہی ہے۔ اور ان دونوں میں بعد مشرقین ہے۔ ایک کے حصہ میں سب کچھ ہے اور ایک کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس عالمگیر فسطائی سامراجی جنگ کے نتیجے کے طور پر گرانی کی شدت سے عوام پریشان حال ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سماج کی اوپری منزل کا بوجھ نچلی منزل نہ سنبھال سکے گی۔ خدا جانے کب جھکولا آجائے۔

بمبئی قابل دید مقام ہے اور یہاں تفریح کے بھی بڑے عجیب وغریب مشغلے ہیں۔ چوپاٹی اور ریس گھر خاص مقام ہیں۔ پانچ پانچ چھ چھ منزل کی عمارتیں شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ دیہاتی ہندوستان جیسی زرعی ملک کی بے کار آبادی کا اور بمبئی جیسی صنعتی شہر کی مصروف آبادی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ عادات، چال چلن ضروریات زندگی، تہذیب، تمدن حتیٰ کہ سیاست میں بھی مختلف ہیں۔

ایشیا کا سب سے بڑا اخبار ٹائیمس آف انڈیا اسی جا سے نکلتا ہے۔ دنیائے صحافت میں یہاں اور بھی اخبار بہت با وقعت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہنر مند یہاں بھوکا نہیں رہتا ہے۔ ع

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

۸۔ مئی کی صبح مراجعت فرمائے بلدہ ہوے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اصحاب کا ایک کثیر مجمع خیر مقدم کے لئے منتظر تھا۔ کایستھ صدر سبھا حیدرآباد اور ملحقہ اداروں کی طرف سے استقبال کی شاندار تیاریاں کی گئی تھیں۔ ٹرین کے پہنچتے ہی پر زور تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ راجہ صاحب ذی مرتبت کا پر جوش استقبال کیا گیا اور کثرت سے پھول کے ہار پہنائے گئے۔ ایک طرف شکتی کنیا پاٹ شالہ کی لڑکیوں نے اپنے قومی ترانے سے آپ کا سواگت کیا تو دوسری طرف جمعیت اسٹیٹ کے دستے نے سلامی دی۔ ایک طرف قومی رضا کاروں کی جماعتوں نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس موقع پر متعدد تصویریں بھی لی گئیں۔ میں اپنے گھر لوٹتے ہوے یہ گنگنا رہا تھا۔

”ہم نے ہر حال میں اپنا تجھے رہبر پایا“

